’المامون‘ کا دیباچہ اور اختلافاتِ شبلی و سر سید: حقائق کی بازیافت

The Forward to ‘Almamoon’ and the Conflict between Allama Shibli and Sir Syed:

Reconsidering the Facts

ڈاکٹر شفیق انجم: ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

Abstract:

Allama Shibli Naomani is commonly known as a loyal colleage of Sir Syed Ahmed Khan but some disagreements also existed between them. These debates became general after the publication of *'Hayat e Shibli'* in 1943. In this book, the biographer Syed Sulaiman Nadwi concluded that Shibli left Aligarh because of Sir Syed. He also described the tense relationship between these two legends. These claims were rejected by Sir Syedians and a chain of writings came into existence discussing Shibli's disloyalty. In this article, this conflict is reconsidered from a new perspective, providing facts to better understand the issue. Furthermore a comprehensive study of the friendly relationship between these two legends has also been presented here, focusing on the forward to Shibli's book *'Al-Mamoon.'*

Keywords: Allama Shibli Naomani, Sir Syed Ahmed Khan, Hayat e Shibli, Almamoon, Syed Sulaiman Nadwi, Aligarh

---

سر سید احمد خان اور علامہ شبلی نعمانی کے تعلقات کو اردو ادب کے ایک عام طالبعلم کی حیثیت سے بیان کیا جائے یا رائج درسی کتابوں کو بنیاد بنا کر سمجھا جائے تو واضح ہے کہ علامہ شبلی، سر سید کی تعلیمی و اصلاحی تحریک کے اہم رکن تھے۔ انھوں نے سر سید کے زیرِ اثر کئی کتابیں تصنیف کیں۔ ان کی تصانیف مسلمانانِ ہند کی فلاح و صلاح کے علی گڑھ پراجیکٹ کے تحت ہیں۔ سر سید کے نامور رفقاء میں سے ایک اہم رفیق ہونے کے ناطے علامہ شبلی کو علی گڑھ تحریک کے عناصر خمسہ میں شمار کیا جاتا ہے، وغیرہ۔ لیکن یہ سادہ کہانی اس وقت گھمبیر صورتحال اختیار کر لیتی ہے جب ہر دو اصحاب کے تعلقات کی بابت مختلف تحقیقی بیانیوں کی طرف رجوع کیا جائے۔ علامہ شبلی کے سوانح نگاروں اور حامی و مخالف تنقید نگاروں نے اس کہانی کو اپنے اپنے انداز میں خوب مزے لے لے کر لکھا ہے۔ اگر محض بڑے ناموں پر ہی اکتفا کیا جائے تو یہ پڑھتے ہوئے عجیب لگتا ہے کہ علامہ شبلی کو سب سے زیادہ بالواسطہ نقصان بابائے اردو مولوی عبدالحق نے پہنچایا۔ مولوی صاحب ہی کی فرمائش پر حافظ محمود شیرانی نے شبلی کی ’شعر العجم‘ پر کڑی گرفت کی۔ حافظ محمود شیرانی کا ’شعر العجم‘ پر پُر مغز تحقیقی مقالہ انجمن ترقی اردو کے رسالے ’اردو‘ میں باہتمام چھاپا گیا۔(۱) اور واضح ہے کہ حافظ

صاحب نے علامہ شبلی کی تحقیقی فروگزاشتوں کی نشاندہی کرتے ہوئے ایسا تند لہجہ اختیار کیا ہے جو ان کی دیگر تحریروں میں نہیں۔ شیخ محمد اکرام کی 'شبلی نامہ' اور یادگارِ شبلی' کو اسی سلسلہء تند کو ملحوظ رکھ کر پڑھا جائے تو متعدد مقامات پر طنزیہ جملے اور خواہ مخواہ کی تفصیلیں چونکاتی ہیں۔(۲) ڈاکٹر وحید قریشی کی 'شبلی کی حیات معاشقہ' اسی سلسلے کی ایک اور کڑی ہے۔(۳) دوسری طرف نظر کی جائے تو سید سلیمان ندوی کی 'حیاتِ شبلی' ایک مختلف انتہا پر نظر آتی ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ شبلی کی عقیدت مصنف کے کانوں کی لووں تک پہنچی ہوئی ہے۔ حمایت شبلی کی ایک جھلک شہاب الدین دسنوی کے ہاں بھی بخوبی دیکھی جاسکتی ہے۔ غور کیا جائے تو اس حمایت و مخالفت کے ڈانڈے سر سید اور علامہ شبلی کے تعلقات سے زیادہ، لکھاریوں کے خود ساختہ گروہی تعصبات سے منسلک نظر آتے ہیں۔ سر سید کے چاہنے والوں اور بعد میں اس سلسلہء چاہت سے وابستہ لکھاریوں نے علامہ شبلی کو نیچا دکھانے کی کوشش کی ہے اور مفروضہ یہ کہ شبلی، سر سید کے خوان کرم سے وابستہ تھے لیکن بے وفا نکلے اور اپنے محسن کے خلاف سرگرم عمل رہے۔ اس مفروضے کے تحت علامہ شبلی مشقِ ستم بنے۔ متخالف دیکھا جائے تو حامیانِ شبلی کی تحریروں میں سر سید قابلِ گردن زدنی ٹھہرے اور کہا گیا کہ سید صاحب کے بے جا تقاضے وجہ بنے۔ قضیہ کیا ہے؟ کیا سر سید اور علامہ شبلی کے تعلقات خوشگوار نہیں تھے؟ کیا ان کے درمیان کبھی بھی گہری رفاقت نہیں تھی؟ کیا سر سید اور علامہ شبلی کے مابین کوئی ذاتی یا نظریاتی سنگین جھگڑا تھا یا یہ محض افسانہ طرازی ہے؟ اگر واقعتاً کچھ تھا تو اس کی نوعیت کیا تھی؟۔۔۔ ان سوالوں کے جواب میں ایک طویل اور مسلسل مطالعے کے بعد چند تحریریں صورتحال سمجھنے میں معاون بنیں لیکن جس تحریر نے مجھے استخراج نتائج کے لیے روکا وہ 'المامون' کا دیباچہ ہے جس کی بابت سبھی جانتے ہیں کہ سر سید کا تحریر کردہ ہے۔ اس مختصر دیباچے کو محور بنا کر سر سید اور شبلی کے تعلقات سے متعلق چند معروضات اس مقالے میں پیش خدمت ہیں۔ کوشش کی گئی ہے کہ اختصار کے ساتھ اس کہانی کے اہم زاویے زیر بحث آجائیں۔ تفصیلی مطالعے اور مزید اخذ و استفادے کے لیے حواشی میں اشارات دے دیے گئے ہیں۔

'المامون' پہلی بار ۱۸۸۹ء میں شائع ہوئی اور چند ماہ کے اندر تمام و کمال بک گئی یا تقسیم ہو گئی۔ نامی اخبارات و جرائد میں ریویو لکھے گئے اور شبلی نعمانی بہ طور مصنف اپنا اعتبار قائم کرنے میں کامیاب رہے۔ کتاب کے اگلے ایڈیشن کی تیاری ہوئی جس کے لیے سر سید نے دیباچہ لکھا۔ اس دیباچے میں انھوں نے دل کھول کر مولانا شبلی کی تعریف کی اور ان کی علمی وجاہت کا چرچا کیا۔ سر سید کے الفاظ پڑھنے کے لائق ہیں، ملاحظہ ہوں:

> "ہم کو نہایت خوشی ہے ہمارے دوست مخدوم اور ہمارے مدرستہ العلوم کے پروفیسر مولانا مولوی محمد شبلی نعمانی نے اس کام کا بیڑہ اٹھایا ہے اور ایک سلسلہ ہیروز آف اسلام کا لکھنا چاہا ہے، اسی سلسلہ کی یہ کتاب ہے، جو المامون کے نام سے موسوم ہے، انھوں نے خلفائے بنی عباس میں سے مامون الرشید بن

ہارون الرشید کو عباسی خلفاء کا ہیرو قرار دیا ہے، اور اس کے تمام کارنامے اچھے یا برے نہایت خوبی اور بے انتہا خوش اسلوبی سے اس میں لکھے ہیں۔"

"۔۔۔ یہ کتاب اردو زبان میں لکھی گئی ہے اور ایسی صاف و شستہ اور برجستہ عبارت ہے کہ دلی والوں کو بھی اس پر رشک آتا ہو گا۔"

"۔۔۔ ہمارے لائق مصنف نے اس کا بہت کچھ خیال رکھا ہے اور باوجود تاریخانہ مضمون ہونے کے ایسی خوبی سے اس کو ادا کیا ہے کہ عبارت بھی فصیح اور دلچسپ ہے اور تاریخانہ اصلیت بدستور اپنی اصلی صورت پر موجود ہے۔"

"۔۔۔ اس کتاب کا حقِ تصنیف مصنف نے اپنی فیاضی اور قومی ہمدردی سے مدرستہ العلوم علی گڑھ کو عطا کیا ہے۔ پہلا ایڈیشن اس کتاب کا اسی سال میں کمیٹی کے فائدے کے لیے چھاپا اور سب فروخت ہو گیا، اور لوگوں کی طلب باقی رہی، میں نے کمیٹی کی طرف سے اس کے فائدے کے لیے دوسرا ایڈیشن نکالنے کا ارادہ کیا اور اس کے لیے یہ دیباچہ لکھا۔"(۴)

اس دیباچے کو متعدد بار پڑھنے کے بعد یہ اندیشہ یقین میں بدل جاتا ہے کہ سرسید و علامہ شبلی کے تعلقات کی بابت جو اصحاب اپنا اپنا ریختہ بناتے چلے آئے ہیں انھیں خبر ہی نہیں کہ وہ کن محترم ہستیوں کو اپنی پراگندہ خیالی کی بھینٹ چڑھائے ہوئے ہیں۔ صاحبانِ علم جانتے ہیں کہ سرسید و شبلی میں بہ اعتبار عمر کوئی مقابلہ بنتا ہے نہ بہ اعتبارِ منصب اور نہ ہی بہ اعتبار علم۔ علامہ شبلی کے چاہنے والے ناراض نہ ہوں تو یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ سرسید کے دستِ شفقت ہی کی بدولت علامہ شبلی نہ صرف ہندوستان کی علمی وادبی دنیا میں متعارف ہوئے بلکہ ذرے سے آفتاب بننے کے مراحل بھی طے کیے۔ اس دیباچے میں بھی سرسید ایک نو آموز مصنف کو جس طرح 'ہمارے دوست مخدوم' کہہ کر متعارف کرا رہے ہیں اور جس طرح 'لائق' اور 'نہایت' 'نہایت' کی تکرار کے ساتھ اُن کی علمی لیاقت کی داد دے رہے ہیں؛ اس پر ریجھنے اور علامہ شبلی کی علمیت کے سورج کو سوا نیزے پر دیکھنے کے بجائے سرسید کے علامہ شبلی سے محبت و مودت کے تعلق کو دیکھنا اہم ہے۔ یہ تعلق دنوں مہینوں کی دین نہیں بلکہ برسوں تشکیل پایا اور ہر دو طرف سے اس تعلق کا احترام اور لحاظ بہ تکرار ملتا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ افسانہ طراز ادیبوں نے کیسے علامہ شبلی کو سرسید کے مقابل لا کھڑا اور وہ بھی ایسے بھونڈے دلائل کی لڑی میں پرو کر کہ جن کا کسی بغض بھرے دماغ کے سوا کہیں کوئی وجود ہے نہ شائبہ۔ تفصیل کے لیے علامہ شبلی کی حیات پر ان کے ہونہار شاگرد علامہ سید سلیمان ندوی کی تالیف 'حیات شبلی' پڑھ لینا ہی کافی ہے۔ سید ندوی کے دیگر علمی کارناموں کے باعث، یہاں احتراماً متعلقہ اندراجات نقل نہیں کیے جا رہے لیکن افسوسناک حقیقت یہی کہ سرسید اور علامہ شبلی کے درمیان اختلافات، رقابت اور باہمی مقابلے جیسی کسی چیز کی دریافت مولف 'حیات شبلی' ہی کی دین ہے۔ اگرچہ اس قضیے کا موجد

مولوی اقبال احمد خان سہیل کو قرار دے کر سید ندوی کو بری الذمہ قرار دینے کی کوششیں بھی ملتی ہیں (۵) لیکن اس طرح ان سینکڑوں صفحات پر مشتمل جارحانہ عبارتوں کا کفارہ ادا نہیں ہو سکتا جو 'حیات شبلی' کے اندراجات کو بنیاد بنا کر وجود میں آئیں۔

اس سے پہلے کہ سر سید و علامہ شبلی کے بے کھوٹ تعلق پر مزید بات کی جائے، ان چیدہ نکات کی طرف اشارت ضروری ہے جو ہر دو اصحاب کے درمیان 'اختلافات' کے جلی عنوان سے بیان کیے جاتے ہیں۔ پہلا نکتہ: سر سید کو 'الفاروق' کی تصنیف و طباعت پر اختلاف تھا۔ اس کی وجہ مسلکی بیان کی گئی ہے۔ دوسرا: سر سید ذاتی تو دُور علمی معاملات میں بھی اختلاف رائے برداشت نہیں کرتے۔ علامہ شبلی چونکہ ان کو اپنے علمیت سے زیر کر لیتے تھے اس لیے سر سید ان سے خائف رہتے۔ تیسرا: علامہ شبلی اپنی قابلیت اور علمیت کی بنیاد پر شہرت کے نصف النہار پر پہنچ گئے اور تعلیمی و سماجی معاملات میں سر سید کی سوچ سے متصادم رائے رکھنے لگے، اس لیے سر سید کو ان پر غصہ تھا۔ چوتھا: سر سید، علامہ شبلی سے اپنی سوانح لکھوانا چاہتے تھے جس سے علامہ شبلی انکاری تھے، نتیجتاً یہ کام مولانا حالی کے سپرد ہوا، سر سید کو اس کا رنج تھا۔ پانچواں: ندوۃ العلماء کے لیے علامہ شبلی کی گرمجوشی سر سید کو ناپسند تھی۔ چھٹا یعنی 'اختلافات کے قصیدے کا آخری بند' سیاسی: سر سید کانگریس کے حامی نہیں تھے، شبلی تھے۔ عجب ہے کہ ان نکات کو 'حیات شبلی' میں شرح و بست سے بیان کیا گیا (٦) لیکن کہانی کی ابتدا میں یہ اقرار بھی ہے کہ ٹھوس شہادتیں کچھ نہیں۔ متعلقہ عبارت دیکھیے:

> اس اختلافِ حال اور کشمکش کے اسباب گو حیاتِ جاوید میں جگہ نہ پا سکے مگر تاریخ کے اوراق سے گم نہیں۔ ضرورت ہے کہ جہاں تک حیاتِ شبلی کا تعلق ہے، ان اسباب پر ایک نظر ڈال لی جائے اور گو خود مولانا نے کہیں تصریح نہیں کی، مگر ان کی تحریروں کے پردے سے اب بھی روشنی چھن چھن کر باہر نکل رہی ہے، اگر ہم ان شعاعوں کو یکجا کر لیں تو ان اسباب پر دن کی سی روشنی پڑنے لگے گی۔"(۷)

'گو خود مولانا نے کہیں تصریح نہیں کی'۔۔۔ لیکن کچھ فسانے بعض سیاسی، مسلکی و علمی وابستگیوں کے تحت بنا لیے جائیں تو کیا حرج ہے۔ جن تحریروں کے پردے سے ایسی روشنی چھن چھن کر باہر نکل رہی ہے، ان کا حوالہ بھی نہیں دیا جائے گا، کیونکہ ایسی کوئی تحریر سرے سے ہے ہی نہیں۔ لیکن چونکہ علامہ شبلی کو 'سر سید کے حلقے سے علانیہ باہر نکلتا دکھانا'(۸) مقصود ہے اس لیے بغیر کسی مستند حوالے کے کچھ بھی کہنا جائز ہے۔

علامہ شبلی کی زندگی کے بعض پہلوؤں کو بنیاد بنا کر اُن کی ذات اور کردار پر جو کیچڑ اچھالا گیا، چاہے وہ عطیہ فیضی سے ان کے تعلقات ہوں یا ابوالکلام آزاد سے شفقت آمیز وابستگی۔۔۔ سر سید سے مقابلے والی کہانی کہیں زیادہ تکلیف دہ ہے۔ ہر دو بزرگان کی زندگیاں اس تہمت سے پاک ہیں۔ اصحاب علم جانتے ہیں کہ ۱۸۸۲ء میں جب علامہ شبلی، سر سید کی خدمت میں پہنچے تو ایک ناکام وکیل سے زیادہ کچھ نہ تھے۔ سر سید کی مدح میں علامہ شبلی کا عربی قصیدہ اور بعد میں مثنوی 'صبح امید' کے مندرجات ایک طرف، علامہ شبلی ہمیشہ سر سید کے زیرِ بار رہے اور سر سید نے ہمیشہ آگے بڑھ کر ان کا ہاتھ تھاما اور حوصلہ بڑھایا۔ علامہ شبلی کے حیات نگاروں

سے حقائق اوجھل نہیں اور یقیناً سب جانتے ہیں کہ کیسی وسعتِ قلبی کے ساتھ سر سید احمد خان نے چوبیس پچیس سالہ نوجوان اسسٹنٹ عربک ریڈر کو اپنے بنگلے کے احاطے میں بنے چھوٹے بنگلے میں رہائش دی اور اپنی لائبریری کے دروازے اس کے لیے کھول دیے۔ علمی ادبی کام اس کے سپرد کیے، اور جس علمیت اور تاریخیت کے بعد میں شبلی وارث بنے وہ سر سید کے کتب خانہ میں موجود یورپ کے عالی دماغوں کی وہ کتابیں تھیں جنھیں دیکھ کر علامہ دنگ رہ گئے۔(۹) سرسید نے ان کے لیے کتب خانے میں کرسی بچھادی۔ اور یہیں ہیروز آف اسلام کا وہ خاکہ تیار ہوا جو پنجاب یونیورسٹی والے ڈاکٹر لائٹنر کی کتاب 'سنین اسلام' (اشاعت:۱۸۷۶ء) کو یکھ کر علامہ کے ذہن میں آیا۔ 'المامون' پر مواد بھی انھیں سرسید کے کتب خانے میں انگریز مصنف پامر کی کتاب 'حیاتِ ہارون الرشید' سے بہم پہنچا۔ یہ سرسید ہی تھے جو لوگوں کو خط لکھ لکھ کر اس نوجوان فاضل کی علمیت کی گواہی دیتے، اس کی کتابیں چھپواتے اور تقسیم و فروخت کے لیے عملی اقدامات کرتے۔ کالج کے جلسوں میں اس کی پذیرائی کرتے اور میگزین میں اس کی تحریریں باہتمام چھاپتے۔ چالیس روپے ماہوار پر بھرتی ہونے والے اسسٹنٹ عربک ریڈر کو اعلیٰ مدارج تک لے جانے میں سرسید کی مدد و اعانت سے کون صرفِ نظر کر سکتا ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ حیدر آباد سرکار میں علامہ شبلی کی رسائی سے پہلے سرسید کے توصیفی خط پہنچے تھے۔ اور یہ بھی ایک بڑی حقیقت کہ انگریز سرکار سے چھتیس سینتیس سالہ عربی فارسی کے استاد کو شمس العلماء کا خطاب دلانے میں بھی سرسید کے خط ہی بنیادی عامل تھے۔ تو ایسے میں یہ گمان کہ سرسید نے علامہ شبلی کو 'الفاروق' تصنیف کرنے سے روکا لیکن علامہ شبلی ڈٹے رہے، اور یہ کہ سرسید نے انھیں اپنی سوانح لکھنے کو کہا لیکن علامہ شبلی ٹال گئے، اور یہ کہ سرسید نے انھیں ندوۃ میں شمولیت سے روکا لیکن علامہ شبلی فیصلہ کر چکے تھے۔۔۔ کتنا مضحکہ خیز لگتا ہے۔ حقیت تو یہ ہے کہ سرسید علامہ شبلی کے خیر خواہ تھے اور اسی لیے انھوں نے 'الفاروق' کی تالیف و اشاعت سے پیدا ہونے والے مسلکی جھگڑے کی نسبت آگاہ کیا تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی کو خط کو لکھ کر اعانت و تائید بھی چاہی تھی۔ ندوۃ العلماء کی کاوشوں کو سرسید نے سراہا۔ ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے نام خط میں ان کی سوچ واضح ہے کہ مسلمانانِ ہند کی بہتری کے لیے ہر کوشش کی وہ تائید کرتے ہیں، "خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ ایسا جلسہ جس میں ہمارے زمانے کے علماء و اکابر واسطے فلاح مسلمانوں کے جمع ہوں گے منعقد ہونے والا ہے"۔(۱۰) اور سوانح لکھوانے والا واقعہ تو غالباً ہوا ہی نہیں، اگر علامہ شبلی سے ایسی خواہش کا اظہار کیا جاتا تو اپنی مرضی سے سر سید کی شان میں قصیدہ اور مثنوی(۱۱) لکھنے والے عقیدت مند شبلی کے لیے یہ خدمت بجالانے میں کوئی امر مانع نہ تھا۔

یہاں 'المامون' کے حوالے سے سرسید کی ایک اور عنایت کا تذکرہ بے محل نہ ہو گا اور وہ یہ کہ کتاب کی مناسب و معیاری اشاعت کے لیے انھوں نے کمال شفقت کے ساتھ علامہ شبلی کی مدد کی تھی۔ حتیٰ کہ علامہ شبلی کے من پسند کاتب کو آگرہ سے علی گڑھ بلانے کے لیے مطبع کے مالک کو لکھا۔ خط کا متن ملاحظہ ہو:

"ایک اور امر ہے کہ کالج کے پروفیسر مولوی محمد شبلی صاحب نے مامون الرشید کے حالات میں ایک کتاب لکھی ہے جو نہایت عمدہ ہے۔ وہ مدرسۃ العلوم کی نذر کریں گے اور کمیٹی اس کو بغرض سوداگری چھاپے گی۔ اس کتاب کو بھی میں آپ کے چھاپہ خانے میں چھپوانا چاہتا ہوں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ مولوی صاحب یہ چاہتے ہیں کہ آپ کے چھاپہ خانے سے ایک کاتب جس نے "عقیدۃ الحسنہ" فارسی رسالہ لکھا ہے، یہاں بلا لیا جاوے اور مولوی صاحب کے سامنے کاپیاں تحریر ہوں اور بعدِ صحت و مقابلہ آپ کے پاس بھیج دی جاویں۔ جو کہ مولوی صاحب کو اس باب میں اصرار ہے، پس آپ کسی طرح ان کی اس درخواست کو پورا کریں۔ اس قدر میں تائید کر سکتا ہوں کہ کاتب کی آمد و رفت کا کرایہ انٹر میڈیٹ میں ادا کروں گا اور جب تک وہ یہاں رہے، اگر مسلمان ہے تو اس کو کھانے کی تکلیف نہیں ہونے کی۔ اس کا بندوبست کر دیا جاوے گا۔ اور اگر ہندو ہو تو اس کی خوراک کی بابت جو آپ تحریر فرماویں گے وہ دیا جاوے گا اور نیز اس کے رہنے کے لیے مکان کا بندوبست کر دیا جاوے گا۔ اس رسالہ کا مسودہ مولوی صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا قریب ۱۲ جزو کے ہے اور وہ رسالہ اس قلم و تقطیع پر چھاپا جاوے گا جیسے کہ ابھی ترجمہء فارسی قدوائی چھپ کر آیا ہے۔ اور میری دانست میں تخمیناً ۱۵ یا ۱۶ جزو اس رسالے کے ہوں گے۔ امید ہے اس کے جواب میں جلد تر مطلع فرماویں گے۔"(۲۱)

۷ اپریل ۱۸۸۸ء کا محررہ یہ خط منشی احمد خان صوفی کے نام ہے جو مطبع مفید عام آگرہ کے مالک اور سر سید سے نہایت درجہ عقیدت و محبت رکھنے والے تھے۔ سر سید کالج کی کتب اور رسائل کے ساتھ اپنی کتابیں بھی اسی مطبع سے شائع کرواتے کیونکہ یہاں کی چھپائی بہت صاف، روشن اور خوبصورت تھی۔ علامہ شبلی کی تصنیف کے لیے بھی انھوں نے اسی مطبع کا انتخاب کیا۔

یہاں ایک اور زاویہ بھی لائق توجہ ہے اور وہ یہ کہ علامہ شبلی نے 'المامون' کے اشاعتی حقوق مدرسۃ العلوم کو تفویض کر دیے تھے۔ یہی نہیں بلکہ بعد کی متعدد تصانیف جنھیں سلسلہ 'ال' کہا گیا، کالج کی تصنیفات قرار پائیں اور علامہ شبلی نے بخوشی کالج کی مالی منفعت کی خاطر ان کے جملہ حقوق کالج کی نذر کیے۔ اس طرزِ عمل سے علامہ شبلی کی مدرسۃ العلوم سے گہری قلبی وابستگی اور سر سید کی ذات پر مکمل اعتماد کا اظہار ہوتا ہے۔ سر سید بھی علامہ کی اس رضاکارانہ دریادلی کے معترف تھے اور احباب کو اس بارے میں لکھتے رہتے تھے۔ مولوی سید حسین بلگرامی کے نام ایک خط کی عبارت دیکھیے:

"پچاس نسخے 'المامون' کے میں خدمتِ عالی میں روانہ کیے ہیں۔ 'گذشتہ تعلیم مسلمانان' صرف معدودے چند رہ گئے ہیں اس لیے وہ نہیں بھیج سکا۔ آپ نے جو کتابوں کو خرید فرمایا، غالباً آپ کو خیال ہو گا کہ گویا ایک اعانت مولوی شبلی کی ہے، مگر مولوی شبلی نے یہ کتابیں مع حق تصنیف وغیرہ کالج کی نذر کر

دی ہیں۔ ان کی قیمت یا منافع سے ایک حبہ کا فائدہ انھوں نے حاصل نہیں کیا۔ اور آئندہ جو کچھ وہ لکھ رہے ہیں صرف کالج کے فائدے کے لیے لکھتے ہیں۔ اپنا ذاتی فائدہ ان کو مقصود نہیں۔ ایسے جاہل آدمی ہیں کہ انھوں نے چند نسخے 'المامون' کے بلا قیمت اپنے دوستوں کو بھیجنا چاہے۔ میں نے ہر چند کہ اصرار کیا کہ جس قدر تمہارا دل چاہے لے لو، ہر گز نہ مانا۔ مجھ سے خرید کیں اور اپنے دوستوں کو بلا قیمت بھیج دیں۔"(۱۳)

ان جملوں کو بار بار پڑھا جانا چاہیے۔ ہر بار کی خواندگی میں علامہ شبلی کی کالج اور سر سید کے لیے بے ریا وابستگی اور سر سید کی علامہ شبلی کے لیے محبت امڈ امڈ کر اپنا اظہار کرتی نظر آتی ہے۔ یہ خط کسی معمولی آدمی کے نام نہیں بلکہ دولت آصفیہ کے ایک نہایت بار سوخ معتمد کے نام ہے۔ یہ وہ صاحب ہیں جن سے سر سید نے 'الفاروق' کی بابت مشاورت کی تھی اور انھوں نے کہا تھا کہ یہ کتاب ضرور لکھی جانی چاہیے۔ اور یہی وہ صاحب ہیں جن کی وساطت سے، بعد میں علامہ شبلی حیدر آباد سرکار سے وظیفہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ سر سید کے اسی خط کا ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو:

"۔۔۔اثنائے سفر میں میرا ارادہ حیدرآباد آنے کا بھی ہے۔ اگر ممکن ہوا تو مولوی شبلی صاحب کو بھی حیدر آباد لاؤں گا تا کہ آپ کو وہ اپنی آنکھ سے دیکھ لیں اور جان لیں کہ آپ کون ہیں اور کیسے ہیں۔"(۱۴)

اور پھر ہوا بھی یوں کہ سر سید مولوی شبلی صاحب کو اپنے ساتھ حیدرآباد لے گئے اور وہاں کے معتمدین سے ملوایا۔ اپنے رفیقِ خاص اور بااعتماد علمی دوست کی حیثیت سے۔ حالانکہ تفاوت عمر کا اندازہ کیا جائے تو علامہ شبلی، سر سید سے کم بیش چالیس سال چھوٹے تھے۔ اور تفاوتِ مقام و منصب کو ملحوظ رکھا جائے تو کوئی تقابل ہی نہیں۔ یہ سر سید کی عالی ظرفی تھی کہ وہ جسے محبوب رکھتے، دوسروں کی نظر میں اسے بلند کرتے کرتے قابلِ رشک بنا دیتے۔ سر سید کا یہ فیضان صرف علامہ شبلی ہی نہیں، اس دور کے بیشتر ناموروں کی ناموری کی سبب بنا۔

حقیقت یہ ہے کہ سر سید اور علامہ شبلی کے درمیان رفاقت کا کم و بیش سولہ سالہ دورانیہ اعلیٰ علمی و ادبی تعاون اور باہمی خلوص و محبت کی ایک خوش کن مہک سے بھرا پڑا ہے۔ اس میں پہلے بارہ سال تو ایسے ہیں کہ جن میں داستان طراز نکتہ وروں کو اپنے مطلب کی کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ تاہم وہ اپنی مایوسی کو آخری چند سالوں کی کہانی میں بغیر سیاق و سباق کے تلاش کرتے اور کسی قدر کامیاب بھی ہوتے ہیں لیکن تاریخی حقائق مسخ تو کیے جاسکتے ہیں، مٹائے نہیں جاسکتے۔ کہنے کو تو کہا جاسکتا ہے کہ سر سید نے علامہ شبلی کو اپنی سوانح لکھنے کا کہا، علامہ نے انکار کیا جس سے اختلافات کی سنگینی بڑھ گئی۔ لیکن اس طرح کی کہانیوں میں ذرا بھی جان نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سر سید کے ایک عقیدت مند مولوی محمد اسماعیل بہ اصرار سر سید کی سوانح لکھوانا چاہتے تھے۔ انھوں نے یہ کام منشی

سراج الدین کے سپرد کیا۔ منشی صاحب جو لکھ کر لائے وہ سرسید کو پسند نہ آیا چنانچہ یہ کام مولانا حالی کے سپرد کر دیا گیا۔ سرسید اس حوالے سے کیسے بے نیاز تھے۔ اس کا اظہار ان کے ایک خط بنام مولوی ممتاز علی سے بخوبی ہوتا ہے۔ عبارت ملاحظہ ہو:

"نئی بات یہ ہے کہ حاجی محمد اسماعیل خان صاحب نے جو میرے لیف (لائف) منشی سراج الدین سے لکھوائی تھی، وہ مسودہ انھوں نے مولوی الطاف حسین کو دے دیا۔ اب مولوی الطاف حسین بطور خود میری لیف (لائف) لکھیں گے اور خود ہی چھپوائیں گے اور جو چاہیں گے کریں گے۔ میں بھی اس پر راضی ہو گیا ہوں کہ مولوی الطاف حسین جو لکھیں چھاپی جاوے۔ الا مولوی سراج الدین نے جو کچھ لکھا تھا وہ چھاپہ ہونے کے قابل نہ تھا۔ بعض واقعات اس میں صحیح نہ تھے اور طرز بیان درست نہ تھا۔ لیف (لائف) ایک مدح نامہ نہیں ہوتی بلکہ ایسی ہونی چاہیے کہ اس شخص کی بھلائی برائی سب کا نمونہ ہوں اور الفاظ مدح و ذم اس سے زائد معنوں پر دلالت کرنے والے نہ ہوں جو در حقیقت اس میں ہو۔ میرے نسبت لکھ دینا کہ بہت ذی علم و فاضل اکمل ہیں کیسی غلط بات ہے۔"(۱۵)

علامہ شبلی اس کہانی میں کہیں بھی نہیں، اگر ہوتے تو سرسری ہی سہی، سرسید تذکرہ کیے بغیر نہ رہتے۔ جہاں تک مدرسۃ العلوم سے علامہ شبلی کی علٰیحدگی کا تعلق ہے تو اس کی وجہ سرسید نہیں، کالج کا وہ ماحول تھا جو سرسید کی علالت کے باعث مسلسل ابتری کی طرف مائل تھا۔ ایسے میں کالج فنڈ میں غبن کے معاملے نے بہت سی نازک طبیعتوں کو ہلا کے رکھ دیا۔ خود سرسید نہایت رنجیدہ خاطر ہوئے۔ سید محمود کی سیکریٹری شپ کا معاملہ اس پر مستزاد تھا۔ پرنسپل کی بڑھتی ہوئی مداخلت اور داخلی حلقہ بندیوں سے جہاں سرسید خود کو فت محسوس کرنے لگے تھے (۱۶) علامہ شبلی جیسا تصنیف و تالیف میں غرق رہنے والا شخص کیسے متاثر نہ ہوتا پس انھوں نے عافیت اسی میں جانی کہ دیگر امکانات کی طرف نظر کی جائے۔ ریاست حیدرآباد سے مثبت جواب آیا تو علامہ شبلی اس طرف ہو لیے لیکن تعلق و مروت دیکھیے کہ کالج سے باقاعدہ استعفٰی سرسید کی وفات کے بعد ہی دیا۔ معلوم نہیں کیوں علامہ شبلی کے حیات نگاروں نے حقائق کو کچھ کا کچھ کر دیا اور سرسید کے طرف داروں نے ان خود ساختہ 'حامیان' کی خبر لینے کے بجائے شبلی کی ذات کو نشانے پر رکھ لیا۔ فی زمانہ ان غلط تفہیمات سے نکلنے کی ضرورت ہے اور اس کی ایک ہی صورت ہے کہ حقائق کو مد نظر رکھتے ہوئے سیاسی و مسلکی تعصبات سے بالاتر ہو کر ہر دو بزرگان کی زندگیوں کو سمجھا اور بیان کیا جائے۔

حوالہ جات / حواشی

ا۔ڈاکٹر خلیق انجم نے اس معاملے کو انجمن کے تعلق سے بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"دلچسپ بات یہ ہے کہ انجمن ہی نے شبلی پر ایسا خطرناک حملہ کیا کہ جس سے وقتی طور پر شبلی کی شہرت کو خاصا نقصان پہنچا۔ میری مراد شبلی کی شعر العجم پر حافظ محمود شیرانی کے اس طویل تنقیدی مضمون سے، جو انجمن ترقی اردو کے سہ ماہی رسالے 'اردو' میں قسط وار شائع ہوا اور بعد میں وہ طویل مضمون کتابی صورت میں بھی شائع کیا گیا۔ ایسے شواہد موجود ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ مضمون مولوی عبدالحق کی فرمائش پر لکھا گیا تھا۔ مولوی صاحب کا علامہ شبلی سے دل صاف نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ مولوی صاحب، سرسید اور حالی کے زبردست حامی بلکہ عاشق تھے۔ اس کے برعکس علامہ شبلی کو سرسید اور حالی دونوں سے بعض معاملات میں اختلاف تھا۔ سرسید سے یہ اختلاف کچھ زیادہ تھا مولوی عبدالحق نے شبلی پر تنقیدی مضمون لکھ کر چھاپنے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان پر ایسا الزام بھی لگایا، جس سے آج تک علامہ کو بریت حاصل نہیں ہو سکی۔ ہوا یہ کہ مولوی محمد امین زبیری نے خطوطِ شبلی کے نام سے، شبلی کے خطوط کا مجموعہ مرتب کیا اور اس پر مولوی عبدالحق سے مقدمہ لکھوایا، مولوی صاحب نے مقدمے میں علامہ شبلی اور عطیہ فیضی کے تعلقات کے بارے میں کچھ ایسے اشارے کیے کہ جن بنیاد بنا کر شبلی کے بعض ناقدین نے ایک دلچسپ رومان پرور طویل داستان مرتب کرلی۔" (شبلی کی حمایت میں، مشمولہ شبلی معاندانہ تنقید کی روشنی میں، انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۸۷ء، ص۶-۷)

مولوی عبدالحق کے معاندانہ عمل کو 'انجمن کی طرف سے خطرناک حملہ' قرار دینا ڈاکٹر خلیق انجم کی اپنی اختراع ہے۔ مزید بے احتیاطی دیکھیے 'مولوی عبدالحق نے شبلی پر تنقیدی مضمون لکھ کر چھاپنے'۔ اصل میں 'لکھوا' لکھنا تھا۔

۲۔'یادگارِ شبلی' میں مصنف نے کمال خوبی سے اپنے ممدوح کو زیر کی کوشش کی ہے۔ جگہ جگہ ایسی اشارتیں، شہادتیں اور اسلوب کی ایسی 'مہارتیں' روا رکھی ہیں کہ کتاب علامہ شبلی کی حیات و خدمات کے غیر جانبدار تذکرے کی بجائے ہجو بن کر رہ گئی ہے۔ ایک جھلک ملاحظہ ہو:

"مولانا کی حساس طبیعت کے لیے یہ ایک اور چرکا تھا۔ اگلے سال انھوں نے زیادہ محنت اور باقاعدگی سے امتحان کی تیاری کی اور ۱۸۸۱ء میں کامیاب ہو کر اعظم گڑھ میں ہی وکالت شروع کی لیکن وہ طبعاً مغرور اور کم آمیز تھے اور ابتدائی سالوں میں تو یہ رنگ بڑا گہرا تھا۔"(ایس۔ایم۔اکرام، یادگارِ شبلی، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، طبع دوم ۱۹۹۴ء، ص۶۹)

۳۔"مولوی عبدالحق نے شبلی اور عطیہ (ملحوظ خاطر رہے کہ عطیہ عمر میں علامہ شبلی سے کم سے کم تیس سال چھوٹی تھیں) کے تعلقات کے بارے میں اظہار رائے کیا تھا۔ شیخ محمد اکرام نے شبلی پر اپنی دونوں کتابوں 'شبلی نامہ' اور پھر 'یادگار شبلی' میں بہت تفصیل

سے گفتگو کی ہے۔ اور ڈاکٹر وحید قریشی نے 'شبلی کی حیات معاشقہ' کے نام سے ایک مستقل کتاب لکھی ان دونوں حضرات نے علامہ کے بارے میں ایسی بے بنیاد، لغو اور مہمل باتیں کیں، جو ہم عام آدمی کے بارے میں بھی کہنے سے پہلے کئی بار سوچیں گے۔ ان حضرات کی کتابوں سے ایک ایسی فضا بن گئی کہ تمام اہل اردو علامہ اور عطیہ کے تعلقات کو اسی روشنی میں دیکھنے لگے۔" (خلیق انجم، شبلی کی حمایت میں، مشمولہ شبلی معاندانہ تنقید کی روشنی میں، ص۷-۹)

۴۔ سید احمد خان، سر، (دیباچہ) المامون از شبلی نعمانی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، انڈیا، اشاعت سوم ۱۹۹۲ء، ۱تا۴

۵۔ ڈاکٹر خالد ندیم کے الفاظ دیکھیے: "اس ساری بحث سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ علی گڑھ اور سرسید کے متعلق شبلی کے مبینہ خیالات اور باہمی کشمکش کی تشہیر نے ہی تنقیصِ شبلی کو فروغ دیا اور یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ 'بزم میں رزم کا رنگ' بھرنے کا کام سید سلیمان ندوی نے نہیں، اقبال احمد خان سہیل نے کیا تھا۔" (خالد ندیم، ڈاکٹر، شبلی شکنی کی روایت اور دوسرے مضامین، نشریات، لاہور، ص۴۵)

شیخ اکرام کی عبارت دیکھیے: "ہمارا خیال ہے کہ ان صفحات کا ہیولیٰ سید صاحب نے نہیں بلکہ ان کے دوست مولوی اقبال احمد سہیل کے دماغ میں تیار ہوا۔" (یادگارِ شبلی، ص۱۰)

۶۔ اس ضمن میں دیکھیے صفحات ۲۸۱ تا ۲۹۶ بہ عنوان سلسلہ 'سرسید سے کشمکش اور اختلاف'؛ حیات شبلی، از سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ایڈیشن ۱۹۹۳ء

۷۔ سید سلیمان ندوی، مولانا، حیات شبلی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ایڈیشن ۱۹۹۳، ص ۲۹۴

۸۔ ایضاً، ص ۲۹۳

۹۔ "اب تک مولانا کے تاریخی معلومات اسی قسم کی کتابوں کے ذریعے سے تھے، جب وہ علی گڑھ پہنچے اور سرسید کے کتب خانہ میں عربی تاریخ و جغرافیہ کی وہ نادر کتابیں ان کو نظر آئیں جو یورپ یا مصر و شام اور قسطنطنیہ میں چھپی تھیں، تو ان کی آنکھیں کھل گئیں اور یہیں سے تاریخ اسلام کے مطالعہ کا نیا دور شروع ہوا۔" (سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، ص۱۳۶)

۱۰۔ سید احمد خان، سر، مکتوبات سرسید (جلد دوم) مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب، لاہور، طبع ثانی جون۱۹۷۶ء، ص۵۰

۱۱۔ "۔۔۔۱۸۸۵ء میں مثنوی 'صبح امید' لکھی جس میں مسلمانوں کے عروج و زوال کی پُر درد داستان کی شرح کے بعد سرسید کی نئی تحریک کی کامیابی پر ایک نئی صبحِ امید کے طلوع کی خوشخبری سنائی، مثنوی بار بار چھپی اور مقبول عام ہوئی۔" (حیات شبلی، ص ۱۳۲)

۱۲۔ سید احمد خان، سر، مکتوبات سرسید (جلد دوم)، ص ۳۳

۱۳۔ سید احمد خان، سر، مکتوبات سرسید (جلد اول)،۷۸-۲۷۷

۱۴۔ ایضاً، ص ۲۷۷

۱۵۔ سید احمد خان، سر، مکتوبات سرسید (جلد دوم)، ص ۱۷۵

۱۶۔ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

"یہ وقت علی گڑھ کی پالیٹکس کا بڑا نازک تھا، ان دنوں سرسید ایک طرف اپنے بیٹے کی بدمستی اور بدمزاجی سے نہایت قلبی کوفت اور اذیت میں تھے اور دوسری طرف سید محمود کی جانشینی اور ٹرسٹیز بل کی منظوری کے سبب سے سرسید کے اچھے اچھے دوست بلکہ دست و بازو ان سے الگ ہو رہے تھے۔ نواب وقار الملک اور دوسرے اکابر ارکان کی طرف سے بالاعلان مخالفت کی تحریریں اخباروں میں جاچکی تھیں، یہاں تک کہ نیک صفات مولانا حالی بھی موافقت نہ کر سکے کہ دفعتہ چند روز کی علالت کے بعد ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو سرسید نے وفات پائی اور ساری مخالفانہ کارروائیاں روک دی گئیں۔۔۔۔ اب کالج سراسر مسٹر بک پرنسپل اور سید محمود کے ہاتھوں میں آ گیا۔ اور سید محمود کی حالت روز بروز بگڑتی ہی گئی۔۔۔۔ مولانا نے فروری میں ہی ارادہ کر لیا تھا کہ وہ پہلی مئی سے چھ مہینہ کی رخصت لیں گے، اس واقعہ کے بعد تو اور ضروری ہو گیا، چنانچہ مئی ۱۸۹۸ء سے پہلے چھ مہینہ کی رخصت لی، پھر استعفا بھیج دیا۔ اس طرح سولہ برس کی پر انقلاب، سبق آموز اور ہنگامہ خیز زندگی کے بعد علی گڑھ کو خیر آباد کہا۔" (سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، ص ۳۲-۳۳۱)

[علامہ شبلی کے کالج چھوڑنے کے حوالے سے علی گڑھ کی پالیٹکس ہی درست تناظر ہے۔ یاد رہے کہ سید ندوی نے کتاب کے صفحات ۲۸۱ تا ۲۹۶ میں اس معاملے کو سرسید سے جوڑنے کو پوری شد و مد سے کوشش کی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ سید ندوی طے کیے بیٹھے تھے کہ سرسید کو لازماً مورد الزام ٹھہرانا ہے۔ اس عبارت میں بھی 'بیٹے کی بدمستی و بدمزاجی' جیسے الفاظ متعصبانہ ہیں۔ کتاب کے دیگر حصوں میں بھی جہاں تہاں انھیں موقع ملا انھوں نے سرسید کو ہدف بنانے کے لیے صاف شہادتوں کی بھی غلط تفہیم و تعبیر کی ہے لیکن قدرت کا کرشمہ دیکھیے کہ فسانہ طرازی کے بعد سچی باتیں بھی ان کے قلم سے سرزد ہو گئیں ہیں۔]